محمد حنیف ندوی

تأثرات

دلیل غائی (Teleological Argument) بھی الہیات میں زیادہ مفید نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ کائنات میں اس کے اچھے خاصے آثار پائے جاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ہر شے اپنے تکمیلی مرحلوں سے دوچار ہے۔ کھرا مادّہ، نباتات کی طرفہ طرازیوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ نباتات کے ڈانڈے حیوانات سے ملے ہوئے ہیں۔ اور زندگی وحیات کا ارتقاء عقل وخرد کی تحیر زائیوں پہ منتج ہے۔ ہم یہاں ایک خاص طرح کے نظم و ترتیب کو بھی دیکھتے ہیں۔ اور حسن وجمال کی دلآویزیوں کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔ مگر یہ کائنات کی وسعتوں کی پوری تصویر نہیں۔ یہاں پر کچھ گھاؤ اور زخم بھی دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں کہیں گڑبڑ اور نظم و ترتیب کی پریشانیاں بھی نظر آتی ہیں۔ نیز فطرت کی ایسی زیاں کاریوں کے نمونے بھی ملتے ہیں کہ جن کی کوئی توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی۔ یعنی اگر اس کائنات کی سج دھج اور رونق ونشاط پہ ایک رنگین دبستاں کا شبہ ہوتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ گل بوٹوں کی ان بوقلمونیوں کے پیچھے ایک نہایت ہی حسین اور بہار آفرین ہاتھ کارفرما ہے، تو اس کے پہلو بہ پہلو اس کائنات کے کچھ پہلو ایسے بھی فکر ونظر کے سامنے آتے ہیں جن سے ربوبیت وشفقت کی کلیتہً نفی ہوتی ہے اور جن میں نظم وترتیب کا فقدان نظر آتا ہے۔

اس دلیل سے زیادہ سے زیادہ جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مادّہ کے ہر ہر ظہور میں نشوو ارتقا کا ایک مکمل منصوبہ پہلے سے موجود ہے۔ جو ماحول کی سازگاریوں سے تکمیل پذیر ہوتا رہتا ہے۔ لیکن کوئی ایسی ذات یا شئے ان ظہورات سے باہر بھی پائی جاتی ہے

جو نشو و ارتقا کے ان مضمرات کو قوت سے فعل میں لاتی اور اپنی مرضی سے ان کو بنا سنوار کر وجود کے نئے نئے خلعت عطا کرتی ہے۔ اس پر یہ دلیل کوئی روشنی نہیں ڈالتی۔ یہی نہیں اگر کائنات میں مقصد و نصب العینیت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق اور غنی و بے نیاز نہیں ہے۔

سائنس کو بھی مقصدیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اگر یہاں کچھ اٹل قوانین مان لیے جائیں اور اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کہ جب الف موجود ہوگا، "ب" پائی جائے گی تو سائنس کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ مقاصد کی تلاش و جستجو اس کے دائرۂ بحث سے خارج ہے۔

ان وجوہ کے پیش نظر کانٹ اس دلیل کو تسلی بخش نہیں سمجھتے۔

وجودی دلیل (Ontological Argument) کا منشا یہ ہے کہ جب ہم اس حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ یہ عالم اپنی تمام دلآویزیوں کے باوجود ناقص ہے۔ اور یہاں کی ہر شے، فنا و زوال کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے، یا غالب کی زبان میں، ہر ہر صورت میں خرابی کی ایک صورت مضمر ہے۔ تو ایک ایسی کامل ہستی کا تصور خود بخود سطحِ ذہن پر ابھرتا ہے جو زوال و فنا کے چکر سے آزاد ہے۔ اور نہ صرف کامل ہے، اور دوام و ابدیت کے وصف سے متصف ہے، بلکہ سرچشمۂ حیات بھی ہے۔ یہ دلیل ایسی مضبوط اور استوار سمجھی گئی ہے کہ قرون وسطیٰ کے مشہور فلسفی ان سیلم نے اسے پورے اعتماد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ کامل کا یہ تصور محض ذہن و فکر کی اپج نہیں ہو سکتا بلکہ یہ خود وجود کے بطن سے ابھرا ہے۔ کانٹ کا اس پر چبھتا ہوا اعتراض یہ ہے کہ تصورِ شے وجودِ شے کو مستلزم نہیں۔ اگر میں سو ڈالر کا تصور کروں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ سو ڈالر میری جیب میں ہیں۔ ہم ایسے جانور کو تصور کی گرفت میں لا سکتے ہیں جس کے پاؤں لوہے کے ہوں، پیٹ سونے کا ہو اور گردن یا سر جواہرات سے مرصع ہو۔ ایسے حیوان کا تصور بھی ممکن ہے جو کار سے زیادہ تیز رفتار ہو، طیارے اور میزائل

کے پر کاٹتا ہو، اور آبدوزوں سے کہیں زیادہ پانی میں غواصی کی صلاحیت رکھتا ہو۔ مگر یہ چیزیں پائی بھی جاتی ہیں؟

ہمارا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ ہم کانٹ کے اعتراضات سے متفق ہیں۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمان متکلمین جب اثبات باری کے مسئلہ پر گفتگو کریں تو وہ ان تمام اعتراضات کو ملحوظ رکھیں۔ اور فکر و استدلال کی کوئی ایسی راہ اختیار کریں جو پامال اور فرسودہ نہ ہو۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں ان دلائل سے تعرض کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ کانٹ کے اندازِ فکر میں کیا خامی ہے۔ مگر ہماری رائے میں یہ مسئلہ اس سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔ ہماری رائے میں کانٹ کی تنقید زیادہ گہری تفصیلی اور واضح تنقید کی خواہاں ہے۔ اس لیے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا وجود برحق ہے، اور اگر عقل و فکر کے پیمانے فہم و استدلال کے سب سے اچھے پیمانے ہیں، تو لازماً ان سے اثبات باری کی تائید ہونا چاہیے۔ ہمیں صرف یہی نہیں بتانا چاہیے کہ کانٹ کے اعتراض میں کیا غلطی ہے کہاں گھپلا اور سفسطہ کارفرما ہے بلکہ یہ بھی بتانا چاہیے کہ اثباتِ باری کے سلسلہ میں اور کس کس انداز اور پہلو کو قابلِ اعتماد سمجھا جا سکتا ہے۔ اس مرحلہ پر یہ اشارہ خاص طور سے غور و تعمق چاہتا ہے کہ کیا الہام و وحی نے اس سلسلہ میں کوئی رہنمائی کی ہے، اور انبیاء نے کسی خاص طریقِ استدلال کی طرف توجہ دلائی ہے؟ اس سے بھی زیادہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا قرآن حکیم نے کسی ایسے منہاجِ عقل کی نشاندہی کی ہے جس سے کہ اس مسئلہ کی پوری پوری وضاحت ہو سکے؟ اور اگر وضاحت کی ہے تو اس کو فلسفہ کی اصطلاحوں میں کس طرح بیان کیا جائے گا۔